© rasailojaraid.com

تاثرات

آہ ـ مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواروی

نہایت افسوس ہے کہ پاکستان کے ممتاز عالم اور ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے سابق رفیق مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواروی ندوی نے ۳۱ مارچ اور یکم اپریل ۱۹۸۲ء کی درمیانی شب کو اکیاسی (۸۱) برس کی عمر پاکر کراچی میں انتقال کیا۔ وہ زندگی کے آخری مرحلے میں عارضۂ قلب میں مبتلا ہوگئے تھے، انھیں ہسپتال میں داخل کیا گیا، لیکن صحت یاب نہ ہوسکے اور اس عالمِ فانی سے منہ موڑ کر سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون۔

پروفیسر محمد اسلم (شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی) نے بتایا کہ عین اسی وقت اور اسی تاریخ پھلواری میں شاہ نظام الدین پھلواروی نے وفات پائی، جو مولانا سید محمد جعفر شاہ کے خالہ زاد بھائی تھے اور عمر میں تین سال بڑے تھے۔ ان کا آپس میں گہرا دوستانہ اور پیار تھا۔ یعنی دونوں دوست اور عزیز ایک ہی وقت اور تاریخ میں جنت کو سدھارے۔ اللھم اغفرلھم وارحمھم وعافھم واعف عنھم۔

مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواروی ۱۹۰۱ء میں پھلواری میں پیدا ہوئے۔ وہ حضرت شاہ سلیمان پھلواروی کے فرزند گرامی قدر تھے۔ ان کے خاندان کا شمار سادات برصغیر کے ان قدیم خاندانوں میں ہوتا ہے جو شرافت و نجابت اور فضل و کمال میں خاص طور سے مشہور ہیں۔ قصبہ پھلواری، جس کی طرف شاہ صاحب منسوب تھے، ہندوستان کے صوبۂ بہار کے ضلع پٹنہ کا مردم آفریں قصبہ ہے۔ اس قصبے کو ساتویں صدی ہجری سے اربابِ زہد و تصوف اور اصحابِ فضائل و عزائم کے مرکز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

آج سے ستر اسی سال پہلے سرزمینِ ہند میں چار سلیمان تھے، جن کی گوناگوں خدمات علمی کے شور سے پورا ملک گونج رہا تھا اور جن کی شہرت پر پرواز لگا کر تمام ہندوستان میں پھیل گئی تھی۔ وہ تھے:

(۱) قاضی سلیمان پوری (۲) شاہ سلیمان پھلواروی (۳) سلیمان اشرف اور (۴) سید سلیمان ندوی۔ ان حضرات نے علی الترتیب ۳۰ مئی ۱۹۳۰ء، ۵ مئی ۱۹۳۵ء، ۲۱ اپریل ۱۹۳۹ء اور ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو اس دنیائے دوں سے کوچ کیا اور جنت کی راہ لی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سید سلیمان ندوی نے شاہ سلیمان پھلواروی کی وفات پر "معارف" میں لکھا تھا کہ ندوہ کے ایک جلسے میں جو لکھنؤ میں غالباً ۱۹۱۵ء میں منعقد ہوا تھا، یہ چار سلیمان جمع ہوگئے تھے۔ اس پر شاہ سلیمان نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ آج کل کئی کئی سلیمان پیدا ہوگئے ہیں، لیکن ان میں اصل سلیمان میں ہوں، سلیمان بن داؤد میں ہوں۔ ع

پریاں نئی نئی ہیں سلیماں نئے نئے

سلیمان کے والد ماجد کا نام داؤد تھا، اس لیے ان کی مہر میں وَ وَرِثَ سُلَیمَانُ دَاوٗدَ کندہ تھا۔ پھر فرمایا، پہلے سلیمان فرد تھا، اب رباعی ہے، چار چار سلیمان یک جا ہیں۔[۵]

مولانا شاہ سلیمان پھلواروی قادری چشتی اپنے عہد کے جید عالم، خوش بیان واعظ، نامور خطیب اور شیخ طریقت تھے۔ پھلواری کے سجادۂ مشیخت پر فائز اور متنوع اوصاف کے مالک تھے۔ وہ اپنے دور کے علم و فیض کے تین سرچشموں سے سیراب ہوئے۔ فرنگی محل لکھنؤ میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی (متوفی ۲۹ ربیع الاول ۱۳۰۴ھ) سے، سہارن پور میں مولانا احمد علی سہارن پوری (متوفی ۶ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ) سے اور دہلی میں مولانا سید نذیر حسین دہلوی (متوفی ۱۰ رجب ۱۳۲۰ھ) سے!

اس طرح انھوں نے اپنے عہد جوانی میں تین باکمال اصحابِ علم سے فیض یاب ہونے کا شرف حاصل کیا۔ ان کا سال ولادت ۱۲۷۶ھ اور تاریخ وفات ۲۷ صفر ۱۳۵۴ھ (۵ مئی ۱۹۳۵ء) ہے۔ اس عالم جلیل کے سانحۂ ارتحال پر برصغیر کے علمی حلقوں میں کہرام بپا ہوگیا تھا اور خیبر سے لے کر کلکتے تک پورے ملک میں صفِ ماتم بچھ گئی تھی۔

شاہ سلیمان کے چار بیٹے تھے۔ سب سے بڑے شاہ حسن تھے جو باپ کی زندگی میں وفات پا گئے تھے، ان کے بیٹے شاہ حسن مثنیٰ ندوی ہیں اور کراچی میں مقیم ہیں۔

دوسرے شاہ حسین تھے جو باپ کی وفات کے بعد پھلواری کی مسندِ مشیخت پر متمکن ہوتے۔ شاہ حسین کے دو بیٹے تھے۔ شاہ زید اور شاہ علی اکبر۔ شاہ زید آج کل کراچی میں ہیں۔ شاہ علی اکبر بھی کراچی میں تھے اور سید محمد جعفر شاہ کے داماد تھے۔ ذہانت و قابلیت کی بنا پر شاہ علی اکبر کا شمار کراچی کے نامور

---

[۵] یادِ رفتگاں۔ ص ۱۶۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لوگوں میں ہوتا تھا۔ کراچی کی مشہور آبادی "شرف آباد" میں مقیم تھے اور وہاں علی اکبر سکوائر ان کے نام سے موسوم ہے۔ آج سے کوئی بیس برس پیشتر عالم جوانی میں فوت ہو گئے تھے۔

تیسرے شاہ غلام حسنین ندوی تھے۔ یہ سید محمد جعفر شاہ سے عمر میں دو سال بڑے تھے۔

چوتھے مولانا سید محمد جعفر شاہ صاحب تھے۔ یہ باپ کی زندگی میں ۱۹۳۳ء میں مشرقی پنجاب کے شہر کپورتھلہ کی شاہی مسجد کے خطیب مقرر ہو گئے تھے۔ ان کے بڑے بھائی شاہ حسین فوت ہوئے تو پھلواری کی مسند مشیخت بھی انہی کے سپرد ہوئی۔ اگست ۱۹۴۷ء تک پھلواری کی مسند مشیخت اور کپورتھلے کی شاہی مسجد کے منصب خطابت پر فائز رہے۔ اس کے بعد پاکستان آ گئے تو ان کے بھائی شاہ غلام حسنین پھلواری کی گدی کے گدی نشین ہوئے۔ شاہ غلام حسنین کا انتقال ہوا تو ان کے نو عمر بیٹے ریحان شاہ نے باپ کی جگہ سنبھالی۔ اب وہ بھی پھلواری سے ترک وطن کر کے کراچی آ گئے ہیں اور کالج میں تعلیم پا رہے ہیں۔ یعنی پھلواری میں اس خاندان عالی مرتبت کا سلسلہ مشیخت اب ختم ہو گیا ہے اور شاہ سلیمان کی اولاد میں سے سب لوگ کراچی آ گئے ہیں۔ البتہ شاہ غلام حسنین کی دو بیٹیاں اور ایک بیوہ وہاں مقیم ہیں۔

مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواروی جن کے بارے میں آج کی صحبت میں کچھ عرض کرنا مقصود ہے بے شمار صفات سے متصف تھے۔ ان کا ہنستا کھیلتا ہوا بادقار چہرہ آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے۔ بار بار خیال آتا ہے کہ جعفر شاہ صاحب ایسا خوش مزاج، بذلہ سنج اور مجلسی آدمی بھلا کیوں کر موت کے سناٹے میں جا سکتا ہے۔ لیکن یہ محض وہم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دو قصہ نفس الواقعہ۔ یہ حادثہ رونما ہو چکا اور شاہ صاحب ہم سے بچھڑ کر موت کی آغوش میں چلے گئے ــــــ ان کو مرحوم لکھتے ہوئے ہاتھ لرزتا اور قلم کا کلیجہ شق ہوتا ہے۔ لیکن اس کا کیا کیجیے کہ زمانے کا دستور ہمیشہ سے اسی طرح چلا آ رہا ہے موت و حیات اس کے لازمی اجزا ہیں، آج ان کی باری ہے تو کل ہماری آنے والی ہے، اس سے کسی کو مفر نہیں۔ انسان کہیں بھی چلا جائے، موت اس کے تعاقب میں رہتی ہے اور اس وقت تک چین نہیں لیتی، جب تک اس کی شہ رگ میں اپنے بے رحم پنجے نہیں گاڑ دیتی۔ قرآن نے کتنی صحیح بات کہی ہے:

اَیْنَ مَا تَکُوْنُوْا یُدْرِکْکُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ ؕ (النساء: ۷۸)

تم کہیں بھی ہو، موت تمہارا ٹھکانا پا کر رہے گی۔ اگر تم اونچے اور مضبوط قلعوں کے اندر چھپ جاؤ، جب بھی اس کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان سطور کے راقم کا گزشتہ پچیس چھبیس سال سے مرحوم سے نہایت قریبی تعلق تھا۔ جس قدر اُن سے قرب و ربط رہا ہے ظاہر ہے اسی قدر ان کی موت سے صدمہ پہنچا ہے۔ یہ صدمہ دل کی ایک ایسی کیفیت سے تعبیر ہے، جس کا قلم کی زبان سے اظہار ممکن نہیں۔ ایک عربی شاعر نے بالکل ٹھیک کہا ہے:

رحلت فخلفت القلوب جريحة   تذوب وجاش الصبر وقل جدوه

یعنی آپ تو رحلت کر گئے مگر ہمارے دلوں کو زخمی کر گئے، آپ کے بعد دل پگھل رہے ہیں اور صبر کی رونق ختم ہو گئی ہے۔

شاہ محمد جعفر پھلواروی نے تصوف و سلوک کی گود میں شعور کی آنکھیں کھولیں اور علم و عرفان کے ماحول میں پرورش پائی۔ قرآن مجید اور اردو، عربی اور فارسی کی ابتدائی کتابیں گھر میں پڑھیں۔ ان کے والد حضرت شاہ سلیمان پھلواروی بہت بڑے عالم اور قاری تھے، جعفر شاہ صاحب نے بھی قرأت و تجوید پر عبور حاصل کیا۔ ساتھ ہی سرکاری سکول میں داخلہ لیا اور میٹرک تک تعلیم پائی۔

وہ زمانہ برصغیر میں سیاسی ہنگاموں کا زمانہ تھا۔ پورا ملک انگریزی حکومت کے خلاف میدانِ عمل میں نکل آیا تھا اور ترکِ موالات کی تحریک زوروں پر تھی۔ خود شاہ محمد جعفر کے والد مکرم حضرت شاہ سلیمان پھلواروی اس تحریک کے اہم رکن تھے۔ اس تحریک کے نتیجے میں شاہ صاحب نے میٹرک کے بعد کالج میں داخلہ نہیں لیا، بلکہ لکھنؤ کا رُخ کیا اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہو گئے، جس کے بانیوں میں خود ان کے والدِ محترم بھی تھے، بلکہ ندوۃ العلماء انہی کی تحریک و تجویز سے کانپور سے لکھنؤ منتقل ہوا تھا، ورنہ بعض حضرات اس کو دہلی لے جانا چاہتے تھے۔

ندوۃ العلماء میں جعفر شاہ صاحب نے اس عہد کے جلیل القدر اساتذہ کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا، جن میں شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ، مولانا عبدالرحمٰن نگرامی، مولانا حیدر حسن ٹونکی، مولانا شبلی فقیہ اور مولانا عبدالودود کے اسمائے گرامی شامل ہیں، رحمہم اللہ اجمعین۔ ان سے تفسیر، حدیث، فقہ، ادبیات اور معقولات کی تکمیل کی۔ ۱۹۲۳ء میں وہ ندوے سے فارغ ہوئے۔ اس کے بعد مضمون نگاری، فتاویٰ نویسی، وعظ و ارشاد، تصنیف و تالیف، تبلیغ و اشاعتِ دین اور روحانی فیض رسانی میں مشغول ہو گئے۔ یہ وہ بنیادی خدمات تھیں، جو اس خانوادۂ عالی قدر کے اصحابِ علم طویل عرصہ سے انجام دیتے آ رہے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۹۳۳ء میں وہ کپور تھلہ کی شاہی مسجد کے منصب خطابت پر فائز ہوئے۔ یہ ایک عظیم منصب تھا جو انھیں پنجاب کی ایک سکھ ریاست میں تفویض ہوا۔ کپور تھلہ میں ان کو بہت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور ہر حلقے کے لوگ نہایت احترام سے پیش آتے تھے۔ ہندو اور سکھ بھی ان کی انتہائی تکریم کرتے تھے۔

آزادی کے بعد وہ کپور تھلہ سے پاکستان آئے اور کچھ عرصہ اوکاڑہ میں مقیم رہے۔

قیام پاکستان کے چند مہینے بعد مغربی پنجاب کی حکومت نے ایک تحقیقی ادارہ قائم کیا، جس کا نام ری کنسٹرکشن آف اسلام (Reconstruction of Islam) تھا۔ اس کے ڈائریکٹر مشہور مسلم عالم علامہ محمد اسد کو مقرر کیا گیا تھا۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر سید نذیر نیازی مرحوم تھے۔ اس ادارے کے ارکان مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواروی، مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا سید شبیر حسین، مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی اور مولانا شفیق الرحمٰن تھے۔ مولانا محمد حنیف ندوی ان دنوں لاہور کی مسجد مبارک میں خطابت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ علامہ محمد اسد ان سے متعارف نہ تھے۔ مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے علامہ اسد سے مولانا ندوی کا غائبانہ تعارف کرایا اور ان کی علمی و فکری اہمیت سے آگاہ کیا اور بتایا کہ اس ادارے میں کام کے لیے وہ موزوں ثابت ہوں گے۔ چنانچہ اسد صاحب کے کہنے سے مہر صاحب جمعے کے روز مسجد مبارک میں آئے اور مولانا ندوی سے گفتگو کی۔ مولانا نے یہ خدمت انجام دینے کی منظوری دے دی۔ پھر اوکاڑہ میں جعفر شاہ صاحب سے بات ہوئی تو انھوں نے بھی اثبات میں جواب دیا۔ اس زمانے میں شاہ صاحب تنہا لاہور تشریف لائے، اہل و عیال اوکاڑہ ہی میں مقیم رہے۔ یہ ادارہ کم و بیش ڈیڑھ سال قائم رہا۔ مغربی پنجاب کے آخری انگریز گورنر فرانسس موڈی نے اسے ختم کر دیا تھا۔ اس کے بعد جعفر شاہ صاحب پھر اوکاڑہ چلے گئے۔

شاہ صاحب کو میں نے سب سے پہلے ۱۹۳۹ء میں فیروز پور (مشرقی پنجاب) میں دیکھا۔ اس زمانے میں وہ کپور تھلے کی شاہی مسجد کے خطیب تھے اور مولانا ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم کے افکار سے متاثر تھے۔ اسی سلسلے میں وہ فیروز پور چھاونی تشریف لائے۔ مولانا عطاء اللہ حنیف کو پتا چلا تو وہ ان سے ملنے گئے اور فیروز پور شہر لے آئے تاکہ وہ ان کے ہاں قیام فرمائیں۔ پھر ایک شخص مستری محمد علی ان کو لے گئے۔ مستری محمد علی نے ان کی آمد پر نماز عشا کے بعد جلسہ عام کا اہتمام بھی کیا تھا جس میں بہت محدود تعداد میں لوگ آئے تھے اور جلسے میں انھوں نے تقریر کی تھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میری عمر اس وقت چودہ پندرہ برس کی تھی اور مولانا عطاء اللہ صاحب[۵۲] کے حلقۂ تلامذہ میں شامل تھا۔ مولانا عطاء اللہ صاحب اور شاہ صاحب مختلف مسائل و معاملات سے متعلق دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ مولانا مودودی صاحب کے افکار بھی زیر بحث آئے، لیکن مولانا عطاء اللہ صاحب کو ان سے زیادہ تعلق نہیں تھا۔ دونوں بزرگ بہت خوش گوار موڈ میں تھے۔

اس سے کچھ عرصہ بعد لاہور میں جماعتِ اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے تاسیسی اجلاس میں برصغیر کے بعض مشہور علما شریک ہوئے تھے۔ مولانا حکیم عبداللہ (روپڑی والے) مرحوم اور مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف نے بھی شرکت کی تھی۔ یہ دونوں حضرات مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ مجھے اس اجلاس کی بہت سی باتیں یاد ہیں۔ اس میں سید محمد جعفر شاہ صاحب بھی موجود تھے۔ مجھے دیگر شرکائے اجلاس کا تو پتا ہے اور اس میں جو کارروائی ہوئی اور جس طریقے سے ہوئی، وہ بھی ذہن میں محفوظ ہے لیکن شاہ صاحب کے بارے میں کوئی بات یاد نہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد وہ کپورتھلہ سے اوکاڑہ منتقل ہو گئے ---- ۱۹۵۰ء کا واقعہ ہے کہ اوکاڑہ میں جامعہ محمدیہ کی طرف سے ایک جلسہ منعقد ہوا۔ اس زمانے میں ہفت روزہ "الاعتصام" گوجرانوالہ سے نیا نیا جاری ہوا تھا، (بعد میں یہ اخبار لاہور منتقل ہو گیا تھا) مولانا محمد حنیف ندوی اس کے ایڈیٹر اور میں ان کا معاون تھا۔ جامعہ محمدیہ اوکاڑہ کے مہتمم مولانا معین الدین لکھوی نے ہمیں بھی اجلاس میں شرکت کی دعوت دی۔ ہم وہاں پہنچے تو شاہ صاحب نے ہم دونوں کو چائے پر بلایا۔ مولانا محمد حنیف ندوی کے وہ پرانے اور بے تکلف دوستوں میں سے تھے، لیکن مجھ سے متعارف نہ تھے۔ نہایت تپاک سے ملے، شان دار چائے پلائی۔ فرمایا "میں وہابی چائے نہیں پلاؤں گا، خالص چائے پلاؤں گا۔" یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔ اس موقعے پر جماعت اسلامی کے ایک صاحب بھی موجود تھے۔ شاہ صاحب نے ان سے تعارف کراتے ہوئے کہا کہ "یہ میرے چائے کے ساتھی ہیں، یہ بھی چائے کے شوقین

---

۵۲ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف (مکتبہ سلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور) پاکستان کے معروف عالمِ دین ہیں۔ ان کے بہت سے علمی کارناموں میں نسائی شریف کا حاشیہ جو التعلیقات السلفیہ کے نام سے شائع ہوا، خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی، اسلامی نظریاتی کونسل اور مرکزی مجلسِ شوریٰ کے رکن ہیں۔ ان کا شان دار کتب خانہ ہے جو کئی ہزار کتابوں پر مشتمل ہے، بہت سی نایاب اور قلمی کتابیں اس کتب خانے کی زینت ہیں۔ لاہور کے انفرادی کتب خانوں میں یہ سب سے بڑا کتب خانہ ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں، اور میں کبھی، بس ہمارا یہی تعلق ہے۔ ورنہ جماعتِ اسلامی اور ان کے فکر و خیال سے اب مجھے کوئی علاقہ نہیں رہا۔" یاد رہے شاہ صاحب تھوڑا عرصہ بعد ہی جماعتِ اسلامی سے الگ ہو گئے تھے۔

شاہ صاحب اس زمانے میں عسرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے چند واقعات بھی بیان کیے، لیکن اس حالت میں بھی نہایت خوش و خرم تھے۔ کوئی حرفِ شکایت زبان پر نہیں آیا۔

اس ملاقات میں انھوں نے اوکاڑہ اور اس کے گرد و نواح کے علما میں سے مولانا عبداللہ کا بہت اچھے الفاظ اور احترام سے ذکر کیا[۳]۔ فرمایا کہ وہ سادہ زندگی بسر کرتے ہیں، بہت خوش طبع عالم دین ہیں۔ رجالِ حدیث پر ان کی گہری نظر ہے، گوشہ گیر قسم کے عالم ہیں۔ جلسے جلوس سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ میرے پاس آیا کرتے ہیں اور بہت سی خوبیوں کے مالک ہیں۔

اس زمانے میں مولانا عبداللہ سے تعارف نہ تھا۔ بعد میں جب "الاعتصام" میں ان کے بعض مضامین اشاعت کے لیے آئے تو پتا چلا کہ واقعی صاحبِ نظر عالمِ دین ہیں۔ کبھی کبھی ادارہ ثقافتِ اسلامیہ میں بھی شاہ صاحب سے ملاقات کے لیے آیا کرتے تھے۔

۱۹۵۰ء میں ادارہ ثقافتِ اسلامیہ قائم ہوا۔ اس کے بانی ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم (متوفی ۳۰ جنوری ۱۹۵۹ء) تھے، جو اس کے پہلے ڈائریکٹر بھی تھے۔ انھوں نے ادارے میں تصنیف و تالیف کے لیے جن ارکان کا انتخاب کیا، ان میں مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواروی کا نامِ نامی بھی شامل تھا۔ وہ ۵ جون ۱۹۵۰ء میں ادارہ ثقافتِ اسلامیہ میں آئے۔ اس سے ایک مہینہ پہلے فقیر کو مولانا محمد حنیف ندوی کا رفیقِ ادارہ مقرر کیا گیا تھا۔ میں اس زمانے میں ہفت روزہ "الاعتصام" (لاہور) کی ادارت کے فرائض انجام دیتا تھا۔ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے دفتر میں میری آمد و رفت تھی۔ وہاں شاہ صاحب سے بھی ملاقات ہوتی اور گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا۔

۱۹۵۸ء کو میں نے سہ روزہ اخبار "منہاج" جاری کیا۔ اب شاہ صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ دراز ہو گیا تھا۔ یہ اخبار صرف ایک سال جاری رہ سکا اور میں نے پھر "الاعتصام" کی ادارت سنبھال لی۔

---

[۳] مولانا عبداللہ صاحب اس زمانے میں اوکاڑہ کے قریب چک نمبر ۲ میں اقامت گزیں تھے۔ اب بہت عرصے سے فیصل آباد کے محلہ جمال عوض میں سکونت پذیر ہیں۔ جید عالم اور خوش مزاج بزرگ ہیں۔ ان کا بہت اچھا کتب خانہ ہے اور مزاج صاحبِ ذوق ہیں۔ مطالعہ ان کا ہر وقت جاری رہتا ہے۔ ان سطور کے راقم پر خاص طور سے شفقت فرماتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۳۰ جون ۱۹۶۵ء کو وہ "الاعتصام" سے علیحدہ ہوگیا اور ۲۱ اکتوبر ۱۹۶۵ء میں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ میں آگیا۔ اب شاہ صاحب کی مجلسوں میں بالالتزام شامل ہونے اور ان کو بہت قریب سے دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔ ان کی وسعتِ تحقیق و کاوش کا تو مجھے پہلے سے علم تھا، لیکن اب قریب آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ تفسیر، حدیث، فقہ، ادبیات اور معقولات و منقولات پر نہ عمیق نظر رکھتے ہیں۔ فقہ کے تمام مکاتبِ فکر، یعنی فقہ مالکی، فقہ شافعی، فقہ حنبلی اور فقہ شیعہ اور اس کے تمام گوشوں سے بہت اچھی طرح باخبر ہیں۔ مختلف مسائل میں ائمہ فقہ کے نقطۂ فکر اور فروعی اختلاف کی نوعیت سے کامل آگاہی حاصل ہے۔ اس کی وضاحت و صراحت اور دلائل کی روشنی میں خاص نتیجے تک پہنچنے میں بھی انھیں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔

ان میں اللہ نے یہ خوبی ودیعت فرمائی تھی کہ اپنا کام چھوڑ کر دوسرے کے علمی کام میں اس کی مدد کرتے اور اس سے خوش ہوتے تھے۔

شاہ صاحب "خشک" عالمِ دین نہ تھے۔ نہایت خوش مزاج، خوش طبع، خوش لباس، خوش خوراک، بلند اخلاق، فراخ حوصلہ اور بذلہ سنج تھے۔ لطافت اور ظرافت میں مشہور تھے۔ شعر و شاعری کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ پرانے اور نئے شعرا کے بے شمار اشعار انھیں یاد تھے۔ فارسی اور عربی کے بھی بہت سے شعر ان کے نوکِ زبان تھے۔ ذہین و فطین اور قوی حافظہ تھے۔ ایسے ایسے لطائف اور چٹکلے بیان کرتے کہ مجلس کشتِ زعفران بن جاتی، لیکن اس کے ساتھ ہی بہت نیک اور پرہیزگار بھی تھے۔ نماز کا وقت ہوتا تو چپکے سے اٹھتے، اندر جاکر نماز پڑھتے اور واپس آجاتے۔ اپنی نیکی اور پاک بازی کا ڈھنڈورہ پیٹنے کے عادی نہ تھے۔ مسائل پر عبور حاصل تھا۔ مختلف اوقات اور مواقع کے لیے جو ادعیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی اور احادیث میں منقول ہیں، انھیں خوب یاد تھیں اور ان کے فوائد دل نشین اسلوب میں بیان کرتے تھے۔

تجوید و قرأت کے قواعد سے پوری طرح واقف تھے اور قرآن مجید کی تلاوت ایسی دل سوزی اور لحن سے کرتے کہ سماں بندھ جاتا اور سامعین کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے۔ ریا و سمعہ اور غرور و نخوت سے انھیں شدید نفرت تھی۔ خلوص و محبت کا پیکرِ حسین تھے۔ دوسرے کی ہمدردی اور دلجوئی ان کی فطرت میں داخل تھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مثنوی مولانا روم سے کہنا چاہیے کہ انھیں عشق تھا۔ کبھی کبھی اس ترنم سے مثنوی کے اشعار پڑھتے کہ جی چاہتا، وہ پڑھتے رہیں اور ہم سنتے رہیں۔

الفاظ کی صحت کا بہت خیال رکھتے۔ اسماء و اعلام کی صحت کا مسئلہ بڑا ہی نازک ہے، اس سلسلے میں ان کی معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ صحیح نام کیا ہے اور اس کا تلفظ کس طرح کرنا چاہیے۔ اگر ان کے سامنے کوئی شخص غلط لفظ بولتا یا کسی معاملے میں لغزش کر جاتا تو اس کا استہزا کرنے کو معیوب قرار دیتے اور فوراً اس کی تصحیح کر دیتے۔ البتہ ناک چڑھے اور مغرور لوگوں سے ان کو نفرت تھی۔

وہ اپنے علم و مطالعہ اور فکر و تحقیق کی بنا پر خاص نقطۂ نظر کے حامل تھے، جس کے اظہار میں کوئی تکلف محسوس نہیں کرتے تھے ـــــ اگر کوئی شخص دیانت داری سے ان سے اختلاف کرتا اور اس کی بات ان کی سمجھ میں آجاتی تو بغیر کسی ذہنی تحفظ کے اس کی بات مان لیتے اور اپنے فکر و خیال سے دست بردار ہو جاتے۔ خواہ مخواہ جھگڑتے رہنا اور نزاع کی سی صورت پیدا کیے رکھنا، ان کے مزاج کے منافی تھا۔ وہ خوش طبع عالم تھے اور ہر معاملے میں خوش طبعی کو ترجیح دیتے تھے۔

۱۹۵۴ء میں مولانا سید رئیس احمد جعفری بھی کراچی سے لاہور آگئے تھے اور ادارہ ثقافتِ اسلامیہ سے منسلک ہو گئے تھے۔ پھر اپنے دمِ واپسیں (۲۷ اکتوبر ۱۹۶۸ء) تک ادارے سے وابستہ رہے۔ بعض مسائل میں وہ شاہ صاحب سے ہم آہنگ نہ تھے۔ کسی معاملے میں بات آگے بڑھ جاتی اور وہ شاہ صاحب کو ٹوکتے تو شاہ صاحب خاموشی اختیار کر لیتے اور رئیس صاحب کو اختلاف رائے کا پورا حق دیتے، یعنی دوسرے کے افکار و آرا کو کھلے دل سے سننا اور اس کی قدر کرنا ان کے نزدیک ضروری تھا۔

شاہ صاحب نے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ میں یکے بعد دیگرے چار ڈائریکٹروں کا زمانہ پایا۔ پہلے ڈائریکٹر ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم تھے، جنھوں نے ۳۰ جنوری ۱۹۵۹ء کو حرکتِ قلب بند ہو جانے سے (کراچی میں) وفات پائی، دوسرے میاں محمد شریف تھے، جو اسی عارضے سے ۱۱ دسمبر ۱۹۶۵ء کو فوت ہوئے۔ تیسرے ڈاکٹر شیخ محمد اکرام تھے، وہ بھی اتفاق سے اسی مرض سے ۱۷ جنوری ۱۹۷۳ء کو راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔ چوتھے ڈائریکٹر اپریل ۱۹۷۳ء میں پروفیسر محمد سعید شیخ مقرر ہوئے جو ادارے کے نظامِ تصنیف و تالیف کو بحمداللہ بہ طریقِ احسن چلا رہے ہیں۔ ان چاروں حضرات کے نزدیک شاہ صاحب کو بڑی قدر و منزلت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حاصل رہی۔

خلیفہ صاحب مرحوم مولانا محمد حنیف ندوی اور مولانا سید محمد جعفر شاہ صاحب سے کہا کرتے تھے کہ مجھے آپ دونوں کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ آپ مسجدوں میں سال ہا سال تک خطیب رہے، لیکن اس کے باوجود زندہ دلی اور ظرافت کو محفوظ رکھا۔ یبوست اور عبوست نام کی کوئی شے آپ کے ہاں نہیں پائی جاتی۔

شاہ صاحب نہایت صابر و شاکر عالم دین تھے۔ کوئی مصیبت پہنچتی تو صبر و ضبط سے کام لیتے۔ تقریباً پچیس سال قبل ان کی اہلیہ فوت ہوئیں تو ان کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا، مگر اسے بے حد صبر سے برداشت کیا۔ پھر اس سے چار پانچ سال بعد جوان داماد نے وفات پائی تو اس پر بھی ضبط و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

ان کا گھرانہ صوفیا کا گھرانہ تھا اور صوفیا کے سب اوصاف شاہ صاحب میں موجود تھے۔ ہم انھیں ازراہِ مزاح "ہشت پہلو" کہا کرتے تھے۔ وہ اس بنا پر کہ ان کے والد ماجد حضرت شاہ سلیمان پھلواروی قادری رحمۃ اللہ علیہ مسلکِ فقہی کے اعتبار سے سخت قسم کے حنفی تھے۔ اساتذہ دار العلوم ندوۃ العلما کے معتدل مزاج بزرگ تھے، شاہ صاحب کی بیوی رشتے میں سید نواب صدیق حسن خاں کی نواسی کی بیٹی یا پوتی تھیں یعنی اس لحاظ سے ان کا تعلق اہل حدیث سے بھی تھا۔ خود شاہ صاحب حنفی المسلک ہونے کے باوجود وسیع القلب تھے۔

سید نواب صدیق حسن خاں سے انھیں بالخصوص دلی لگاؤ تھا، ایک دن انھوں نے مجھے پانچ یا چھ چینی کی طشتریاں دکھائیں جو نہایت خوب صورت اور مضبوط تھیں اور وہ نواب صاحب ممدوح کے استعمال میں رہی تھیں، ان پر نواب صاحب کا نام خوب صورت الفاظ میں لکھا ہوا تھا۔ فرمایا، یہ طشتریاں ان کی بیوی کو ملی تھیں، نواب صاحب کے چند اور برتن بھی انھیں ملے تھے جو ٹوٹ گئے ہیں یا گم ہو گئے ہیں ان پر بھی نواب صاحب کا اسمِ گرامی کندہ تھا۔

شاہ صاحب کا خاص اسلوبِ تحریر تھا، وہ تحریر میں املے کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ مثلاً وہ یہ نہیں لکھتے تھے کہ "اس واقعہ کے بارے میں" بلکہ "اس واقعے کے بارے میں" لکھتے تھے۔ بعض دفعہ املے کی اس سخت پابندی پر ان سے بحث بھی ہو جاتی تھی، مگر وہ اس کے بہت پابند تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ چھوٹوں پر بے حد شفقت فرماتے اور اُن کی دل جوئی اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ جس زمانے میں میں "الفہرست" کا ترجمہ کر رہا تھا، ہم دونوں ایک ہی کمرے میں بیٹھتے تھے۔ ایک دن ایک مقام پر الفاظ کو سمجھنے میں مجھے کچھ دقت پیش آئی۔ کافی سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے۔ شاہ صاحب سے رجوع کیا تو انھوں نے مجھ سے اختلاف کیا اور فرمایا جو تم نے ترجمہ کیا ہے وہ صحیح نہیں صحیح ترجمہ یہ ہے۔! میں نے عرض کیا میں یہ تو نہیں کہتا کہ آپ کا ترجمہ صحیح نہیں، البتہ اس پر مجھے اصرار ہے کہ میرا ترجمہ صحیح ہے۔ وہ ہر وقت خوش رہتے تھے، فرمایا کسی سے فیصلہ کرالو۔ اگر تمھاری بات صحیح ہوئی تو پانچ روپے انعام دوں گا۔ اگر میری بات صحیح ہوئی تو تم سے کچھ نہیں لوں گا۔ میں نے کہا کس سے فیصلہ کرائیں؟ فرمایا، ایک ہی تو شخص ہے جس سے یہ فیصلہ کرایا جا سکتا ہے اور وہ ہیں مولانا محمد حنیف ندوی! یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اتفاقاً مولانا ندوی ہمارے کمرے میں آتشریف لے آئے۔ کہا کس مسئلے پر بحث ہو رہی ہے؟ شاہ صاحب نے الفہرست کا وہ مقام انھیں دکھایا اور فیصلہ طلب کیا۔ انھوں نے کچھ غور کرنے کے بعد میرے حق میں فیصلہ دے دیا۔ شاہ صاحب نے کوئی بحث نہیں کی اور پانچ روپے جیب سے نکال کر مجھے دینے لگے۔ میں نے انکار کیا تو مولانا ندوی نے کہا "سید کا تبرک ہے، لے لو اور مجھے بھی ان کی نذر کر دو۔" شاہ صاحب مسکرا دیے، ہم نے اسی وقت پانچ روپے کی کوئی چیز منگوائی اور کھا لی۔

شاہ صاحب اپنے کام اور فرائض کی انجام دہی میں نہایت تیز اور محتاط تھے۔ ریڈیو پاکستان لاہور سے، ان کی جو تقریریں نشر ہوئیں، ان کے بارے میں ریڈیو پاکستان کے عبدالحی قریشی صاحب نے بتایا کہ ۱۹۵۶ء سے ان تقریروں کے مسودات محفوظ ہیں ـــ لیکن تقریروں کا سلسلہ ۱۹۵۶ء سے پہلے سے جاری تھا۔ اس زمانے میں پیشگی ریکارڈنگ کی سہولت میسر نہ تھی۔ شاہ صاحب سمن آباد میں رہتے تھے سحری کی تقریر کے لیے رات کو ڈھائی بجے ریڈیو سٹیشن پہنچتے، کھانا ساتھ لے کر آتے، ارکانِ عملہ کے ساتھ مل کر کھاتے، وہیں تہجد کی نماز پڑھتے، فجر کی نماز بھی وہیں ادا کرتے۔ پھر گھر جاتے۔ گرمی کا موسم ہو یا سردی کا، ان کا ہمیشہ یہی معمول رہا۔ یہ احساسِ ذمہ داری کا بہت بڑا ثبوت ہے۔

کھانے اور کھلانے کا انھیں بہت شوق تھا۔ دفتر کے ارکان کو کبھی کبھی گھر پر بلاتے اور پر تکلف کھانا کھلاتے۔ بعض دفعہ کسی ہوٹل میں لے جاتے اور ہر شخص کے ذوق اور پسند کے مطابق کھانے کا آرڈر دیتے۔ مولانا محمد حنیف ندوی ان کو کم کھاتے ہوئے دیکھ کر ازراہ مذاق کہا کرتے تھے کہ شاہ صاحب نہایت مخصوص قسم کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے گھبراتے ہیں۔

شاہ صاحب جھاڑ پھونک اور تعویذ وغیرہ بھی خاص خاص لوگوں کے لیے کرتے تھے۔ لیکن اس کے بدلے میں کوئی چیز کسی سے لیتے نہیں تھے۔ ایک دفعہ ایک دوست کی بیوی اور بیٹی بیمار پڑ گئیں۔ اس نے مجھ سے کہا کہ تم شاہ صاحب سے کہو کہ میرے گھر چلیں اور ماں بیٹی کو دم کر دیں۔ میں نے شاہ صاحب سے عرض کیا۔ شاہ صاحب نے فرمایا، وہ میرے مکان پر آ جائیں اور مجھے اپنے گھر لے چلیں۔ وہ شخص گیا، شاہ صاحب نے رکشہ لیا اور اس کے گھر پہنچ گئے۔ وہ شخص رکشے کا کرایہ دینے لگا تو فرمایا، رکشہ میں نے لیا تھا، کرایہ میں ہی دوں گا۔ اس کی بیوی اور بیٹی کو دم بھی کیا، تعویذ بھی دیا اور کچھ روپے بھی عنایت کیے، انھوں نے لینے سے انکار کیا تو فرمایا مریض کو کچھ دینا چاہیے، اس سے لینا نہیں چاہیے۔ شرعی مسئلہ یہی ہے۔ ان سے نہ چائے پی نہ پانی پیا کہ بیمار سے کھانا پینا مناسب نہیں، یہ لوگ تو خود تکلیف میں مبتلا ہیں، دوسرے لوگ کیا کھلائیں گے۔ پھر باہر آ کر واپسی کے لیے رکشہ لیا، وہ کرایہ دینے لگا تو فرمایا، آپ کو کیوں تکلیف دوں، مجھے اپنے گھر اپنے ذرائع سے پہنچنا چاہیے۔

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ میں جعفر شاہ صاحب بھی تھے اور رئیس احمد جعفری بھی۔ دونوں بہت خوش طبع تھے۔ مولانا محمد حنیف ندوی بھی بے حد خوش طبیعت ہیں۔ جعفر صاحب یا جعفری صاحب سے کوئی صاحب ملنے کو آتے تو مولانا ندوی پوچھتے "ہم نے دفتر میں جوڑا رکھا ہے، جعفر بھی اور جعفری بھی۔ آپ کو کس کی ضرورت ہے۔" مولانا ندوی کے اس فقرے سے دونوں (مرحومین) بہت محظوظ ہوتے، ملاقات کو آنے والے بھی خوش ہوتے۔

شاہ صاحب عام طور پر کرتہ، پاجامہ، شیروانی اور جناح کیپ پہنتے تھے۔ کبھی کبھی لباسِ مشیخت بھی زیب تن فرماتے تھے۔ یعنی پاجامہ، جبہ اور سبز عمامہ! مگر یہ عجیب بات ان میں دیکھی کہ کسی شادی کی تقریب میں شرکت کرتے تھے تو انگریزی سوٹ اور ہیٹ پہن کر آتے۔ (کم از کم میں نے تین چار مواقع پر انھیں اسی لباس میں دیکھا)۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی صاحب زادی کی شادی تھی کہ وہ اسی لباس میں آ گئے۔ مولانا محمد حنیف ندوی بھی موجود تھے۔ خلیفہ صاحب نے مولانا ندوی سے کہا "کسی نکاح خواں کو لایئے" مولانا شاہ صاحب کو اٹھا کر لے گئے، کہا "جلدی میں کوئی مولوی تو ملا نہیں، پادری کو لے آیا ہوں۔" مجلس میں ایک قہقہہ بلند ہوا، اور شاہ صاحب نے نکاح خوانی کے فرائض ادا کیے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی طرح لاہور کے سابق ایس ایس پی رانا جہاں داد خاں کی لڑکی کی تقریبِ شادی میں مجھے شرکت کی دعوت دینے کے لیے رانا صاحب کے چھوٹے بھائی رانا غلام صابر خاں مرحوم دفتر آئے۔ وہ اس زمانے میں پاکستان کی پارلیمنٹ کے رکن تھے اور میرے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا محمد جعفر شاہ صاحب کو بھی دعوتی کارڈ پیش کرنا ہے اور نکاح بھی وہی پڑھائیں گے۔ میں نے ان سے شاہ صاحب کا تعارف کرایا اور شرکت کی دعوت دی۔ شاہ صاحب انگریزی لباس پہن کر آئے اور خطبۂ نکاح کے بعد میاں بیوی کے حقوق پر انگریزی میں تقریر کی۔ کسی نے کہا اس کا ترجمہ بھی کیجیے۔ فرمایا، "ترجمان کوئی اور ہوتا ہے، مقرر ترجمہ نہیں کرتا۔"

شاہ صاحب بہت خوش مزاج اور حاضر جواب تھے۔ ایک دفعہ ہمارے دفتر میں ہالینڈ کے ایک مستشرق آئے۔ وہ ادارے کے سیکرٹری جناب محمد اشرف ڈار صاحب کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ مولانا محمد حنیف ندوی اور شاہ صاحب بھی موجود تھے۔ میں بھی شریکِ مجلس تھا۔ ہالینڈ کے مستشرق بلیان (Baljon)، انگریزی میں بات کرتے تھے اور مولانا محمد حنیف ندوی اردو میں جواب دیتے تھے، ڈار صاحب انگریزی میں ترجمہ کرتے تھے، لیکن مولانا کو ان کی بات سمجھانے کے لیے ترجمے کی ضرورت نہ تھی؛ کیوں کہ مولانا انگریزی سمجھتے اور جانتے تو ہیں، لیکن بولتے نہیں ہیں۔ شاہ صاحب ان کے ساتھ انگریزی میں بات کرتے تھے۔ انھوں نے مولانا سے کہا "آپ انگریزی سمجھتے ہیں اور بولتے نہیں"۔ شاہ صاحب نے کہا "یہ انگریزی سمجھتے ہیں اور بولتے نہیں، میں انگریزی بولتا ہوں اور سمجھتا نہیں"۔ وہ مستشرق بھی زندہ دل تھے۔ اس فقرے پر خوب ہنسے اور شاہ صاحب کو اس کی داد دی۔

ایک دن شاہ صاحب سے میں نے کہا، آپ بہت بڑے پیر اور گدی نشین تھے، وہی کام کرتے رہتے، بہت اچھا کام تھا، دوسرے جھمیلوں میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ کہنے لگے جب میرے والد پیر تھے، میں کہا کرتا تھا کہ یہ آمدنی ناجائز ہے، مرید پیسے دیتے ہیں اور ہم کھاتے ہیں۔ ان کی وفات کے بعد میرے بڑے بھائی شاہ حسین گدی نشین ہوئے تو میں ان کی آمدنی کو اور زیادہ زور سے محلِ تنقید ٹھہرانے لگا۔ ان کے بعد میں خود پیر بن گیا۔ اب دیکھتا ہوں کہ لوگ آتے ہیں اور جبراً اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ کہیں پیر صاحب مریدوں کے ساتھ پیدل جا رہے ہیں، کہیں بیل گاڑی میں جا رہے ہیں، کہیں سائیکل پر جا رہے ہیں، کبھی سائیکل خود چلا رہے ہیں، کبھی کسی کے آگے یا پیچھے بیٹھے ہیں، کہیں پگڈنڈی ہے، کہیں کانٹے ہیں؛

© rasailojaraid.com

اور بڑا حال ہو رہا ہے۔ پھر چائے کو جی چاہتا ہے تو مرید دوڑے دوڑے آتے ہیں کہ حضرت! یہ نوش فرمایئے۔ چائے گرمی پیدا کرتی ہے، اسے چھوڑ دیجیے۔ حقے یا بیڑی کی طلب ہے تو پی نہیں سکتے کہ مریدوں پر برا اثر پڑے گا۔ لیٹنے کو جی چاہتا ہے تو تعویذ اور دم کرانے والے آ گئے ہیں، سونے کو جی چاہتا ہے تو مرید درس و وعظ کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ لطیفے بازی کو جی چاہتا ہے تو مریدوں کی وجہ سے خاموشی اختیار کرنا پڑتی ہے، پاؤں پھیلا کر بیٹھنے کو جی چاہتا ہے تو آدابِ مجلس کے خلاف ہے۔ بس دو زانو ہو کر بیٹھے ہیں۔ واپس گھر جانے کو جی چاہتا ہے تو مرید جانے نہیں دیتے اور دوسرے گاؤں لے جانے پر اصرار کرتے ہیں۔ مسلسل مصیبت میں مبتلا ہیں۔ اس صورتِ حال سے جب میں خود دوچار ہوا تو آنکھیں کھلیں اور اپنا نقطۂ نظر بدلنا اور یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا کہ حلال کی کمائی یہی ہے جو اتنی مشقت اور محنت سے حاصل ہوتی ہے اور جس میں دل اور جسم کو اس قدر تکلیف میں ڈالا جاتا ہے ــــ یہ بات انھوں نے کچھ ایسے اسلوب سے بیان کی کہ لطائف کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور "محنت و مشقت" والی کڑی کمائیوں پر اظہارِ خیال ہونے لگا۔

شاہ صاحب اپنے ملنے والوں اور تعلق داروں سے نہایت ہمدردی اور خیر خواہی کا برتاؤ کرتے اور ان کی مدد کو ضروری قرار دیتے تھے۔ میں نے ۱۹۶۷ء میں لاہور کی ایک آبادی سانده میں چھوٹا سا مکان بنایا تو اس پر بہت خوشی کا اظہار کیا۔ کافی عرصے بعد ایک دن مجھ سے کہا کہ آپ نے مکان تو بنا لیا لیکن جس کو پنجابی میں "چٹھ" کہتے ہیں وہ نہیں کی اور ہمیں دعوت نہیں کھلائی۔ میں نے عرض کیا، ایک اور کمرہ تعمیر ہو جائے تو آپ کو تکلیف دوں گا اور گھر لے جا کر دعا کراؤں گا۔ فرمایا، اس کمرے پر کتنے روپے خرچ ہوں گے، عرض کیا، معمار نے تین ہزار روپے کا اندازہ لگایا ہے، چند روز تک مجھے پیسے ملنے والے ہیں، پھر کام شروع کراؤں گا۔ فوراً چیک بک نکالی اور میرے نام کا اٹھارہ سو روپے کا چیک کاٹ دیا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور عرض کیا کہ اس کی ضرورت نہیں، بس چند روز کی بات ہے، روپے مل جائیں گے۔ فرمایا، یہ روپے خرچ کرو، مجھے تین مہینے کو دے دینا، چھ مہینے کو دے دینا، پھر فوراً فرمایا، اچھا دس مہینے کو دے دینا۔ ساتھ ہی فرمایا، میں کہتا تو نو مہینے چاہتا تھا، لیکن اس خیال سے کہ تم اس مدت کو مذاق پر محمول کرو گے، دس مہینے کہہ دیا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ کسی کو بتانا نہیں، میرا ثواب ضائع ہو جائے گا ــــ میں نے چیک لے لیا، لیکن کئی دن بینک سے رقم وصول نہیں کی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس اثنا میں یہ چیک انھیں واپس لینے پر اصرار کرتا رہا، لیکن انھوں نے نہیں لیا، تو میں نے دفتر میں سب کو بتا دیا اور بات پھیل گئی۔ ایک دن مجھ سے کہا تم نے یہ کیوں بتایا کہ میں نے اتنے روپے کا چیک دیا ہے؟ عرض کیا، قرآن کا حکم ہے کہ کسی سے لین دین کرو تو لکھ لیا کرو؛ ہم نے چوں کہ نہیں لکھا، اس لیے میں نے بتا کر ان لوگوں کو گواہ بنا لیا ہے۔ اگر میں یہ رقم واپس کرنے سے انکار کر دوں تو یہ گواہی دیں گے کہ اتنی رقم آپ نے مجھے بہ طور قرض دی ہے۔ اس توجیہ سے مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

اس میں عجیب بات یہ ہوئی کہ میں نے ایک کمرے کی تعمیر کا کام شروع کیا تو آٹھ ہزار روپے خرچ ہوئے اور سب قرض۔ ایک دن مولانا محمد حنیف ندوی اور بعض دیگر حضرات کی موجودگی میں شاہ صاحب سے میں نے عرض کیا کہ آپ نے اٹھارہ سو روپے دیے اور آٹھ ہزار خرچ ہوئے، یا تو آپ کے روپے بہت منحوس تھے کہ مجھے چھ ہزار روپے کا اور مقروض بنا دیا، یا بہت بابرکت تھے کہ چھ ہزار کا ان کی وجہ سے مزید اضافہ ہو گیا۔ فرمایے، صحیح بات کون سی ہے؟ فرمایا پہلی! یہ روپے چند روز بعد میں نے واپس کر دیے۔ شاہ صاحب کو گھر پر بلایا، دعا کی اور بہت خوش ہوئے۔

شاہ صاحب کی زوجہ مرحومہ بہت سلیقہ شعار خاتون تھیں، علم و ادب سے انھیں لگاؤ تھا۔ اردو زبان سے بالخصوص تعلق تھا۔ جب شاہ صاحب سے اردو کے سلسلے میں کوئی بات پوچھی جاتی اور وہ صحیح طور سے نہ بتا سکتے تو فرماتے "زوج اللغات" سے رجوع کروں گا اور کل بتاؤں گا۔

شاہ صاحب کسی زمانے میں حقہ نوشی کرتے تھے، سگریٹ اور بیڑی بھی پیتے رہے۔ لیکن ۱۹۶۲ء میں اسے ترک کر دیا تھا۔ ایک دن اس کے "فوائد" کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا۔ فرمایا، قیام پاکستان کے چند روز بعد، میں لاہور میں تھا اور چھاونی کی طرف سے پیدل شہر کو آ رہا تھا۔ سر پہ پگڑی باندھے ہوئے تھا۔ میں نے دیکھا کہ چند نوجوان جو مجھ سے کچھ فاصلے پر دوسری طرف جا رہے تھے، مجھے دیکھ کر ٹھٹکے اور میری طرف اشارہ کر کے باتیں کرنے لگے۔ میں نے سوچا کہ انھوں نے مجھے سکھ سمجھا ہے اور وقت شہادت آپہنچا ہے۔ ان کے ارادے بھانپ کر میں کھڑا ہو گیا، جیب سے سگریٹ نکالا، سلگایا، کش لگایا، دھواں فضا میں چھوڑا اور چل دیا۔ ان نوجوانوں کو دیکھا تو آگے نکل چکے تھے۔ یہ گویا میرے اسلام کا "ثبوت" تھا۔

اوراد و وظائف کے سلسلے میں ان کے کچھ تجربات تھے۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا بٹوا گم ہو گیا۔ اس میں اچھی خاصی رقم تھی، بہت تلاش کیا، نہ ملا، وہ بڑے پریشان ہوئے۔ شاہ صاحب کو بتایا گیا تو انھوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے کچھ وظیفہ پڑھ کر دو تین دفعہ تالی بجائی، اور تھوڑی دیر بعد دیکھا تو بٹوا خلیفہ صاحب کی جیب میں تھا۔

شاہ صاحب مرحوم کا خاندان صوفیا اور علما کا خاندان تھا اور یہ سب لوگ بامذاق، خوش طبع اور حاضر جواب بھی تھے۔ شاہ صاحب کے ماموں ہندوستان کے ممتاز عالم حضرت مولانا شاہ عین الحق پھلواروی تھے۔ وہ اہل حدیث ہوگئے تو کسی نے غالباً حضرت شاہ سلیمان پھلواروی سے کہا کہ سید تو "آیۃ من آیات اللہ" ہوتا ہے، یہ شاہ عین الحق وہابی کیوں ہوگئے۔ کیا یہ آیۃ نہیں ہیں؟ فرمایا، شاہ عین الحق بھی آیۃ من آیات اللہ ہیں، لیکن آیتِ منسوخہ ہیں۔

شاہ صاحب کی یہ عادت تھی کہ لطائف سے بہت خوش ہوتے۔ خود بھی لطیفے کی زد میں آجاتے تو محظوظ ہوتے۔ بتایا کبھی کہتے کہ فلاں آدمی نے مجھے نشانہ بنایا اور میں اس سے خوش ہوا۔ ایک دفعہ فریضۂ حج ادا کرنے گئے، واپس آئے تو پوچھا، سفرِ حج کی کوئی خاص بات بتائیے۔ فرمایا خاص بات یہ ہے کہ میرے ایک ہندوستانی دوست جو جدّے میں رہتے ہیں، مجھ سے ملے۔ انھیں شعر و شاعری اور ادبیت سے لگاؤ ہے۔ کہا میں نے ایک مجلسِ مشاعرہ کا انتظام کیا ہے، جس میں پاکستانی اور ہندوستانی شعرا شرکت کر رہے ہیں، اس میں آپ کی شرکت ضروری ہے۔ آپ اپنا کلام پیش کریں گے۔ میں مان گیا۔ انھوں نے میرے نام کا اعلان کیا اور کہا کہ یہ حج کے لیے آئے تھے اور ان کی آمد سے ہم نے فائدہ اٹھایا ہے۔ ایک طرف سے آواز آئی "نوسو کا کورس پورا کر کے آئے ہیں" اتفاق سے میں نے نظم بھی وہی پڑھی جو قیامِ اوکاڑہ کے زمانے میں لکھی تھی اور اوکاڑے میں چوہوں کی کثرت سے متعلق تھی۔ سامعین نے خوب داد دی اور میں نے ثابت کر دیا کہ نوسو کی منزلِ محاورہ سے بہت آگے نکل چکا ہوں۔

شاہ صاحب صلح کل اہلِ علم تھے۔ ان کا اپنا ایک نقطۂ نظر تھا، جس کے اظہار میں انھیں کوئی باک نہ تھا۔ لیکن کسی سے تعلقات خراب نہیں کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ زخم کرنا آسان ہے، اس کا اندمال مشکل ہے۔ علم و تحقیق کے میدان میں ایک دوسرے سے اختلافات بہرحال ہوتے ہیں، ان کو وجہِ انقطاع نہیں بنا لینا چاہیے۔ اہل علم کو آپس میں لڑنا نہیں چاہیے، اتفاق سے رہنا چاہیے اور ہر شخص کی قدر کرنی چاہیے۔ جو علم لڑائی سکھاتا ہے، وہ علم نہیں جہالت ہے۔ جس علم سے رواداری اور محبت کا جذبہ نہیں ابھرتا، اس کو علم کہنا علم کی توہین ہے۔ وہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ آج کل کے بعض اہل علم باہم کسی مسئلے میں اتفاق نہیں کرتے، ان کا اتحاد صرف ایک جگہ پر ہوتا ہے اور وہ ہے دسترخوان۔ یہاں کوئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لڑائی جھگڑا نہیں ہوگا۔ سب کامل اتفاق سے اکل و شرب کا فرض انجام دیں گے۔ !!

ان کو کسی سے لڑنے اور گریبان پکڑ کر گھسیٹنے کی ہرگز عادت نہ تھی، یہ حرکت ان کی فطرت کے خلاف تھی۔ چنانچہ وہ بعض امور کی وجہ سے جماعت اسلامی سے نکلے اور خاموشی اختیار کر لی۔ ایک دن میں نے عرض کیا جماعت اسلامی سے "خروج" کی کیا وجہ تھی؟ فرمایا: "وہ ایک ٹریننگ سکول تھا اور ٹریننگ سکول میں ہمیشہ نہیں رہا جاتا، ایک خاص مدت کے لیے ہی رہا جاتا ہے"۔ پھر فرمایا "اب تو یہ ٹریننگ سکول بھی نہیں ہے"۔

ریڈیو پاکستان، لاہور نے ان کے جنازے کے دن یکم اپریل ۱۹۸۲ء کو (نو بجے شب) ان کے بارے میں ایک پروگرام نشر کیا، جو ان کے معتقد خاص اور ریڈیو کے پرانے رکن جناب عبدالحی قریشی نے ترتیب دیا تھا۔ اس میں مولانا محمد حنیف ندوی، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی اور خود عبدالحی قریشی صاحب نے حصہ لیا۔ پروگرام کے آغاز میں شاہ صاحب کی دو تقریریں نشر کی گئیں، ایک بچوں کے بارے میں اور ایک بڑوں کے بارے میں۔ دونوں میں انداز و الفاظ کا واضح فرق تھا۔ بچوں کے لیے انداز و اسلوب اور تھا، اور بڑوں کے لیے اور۔! بعد میں شرکائے پروگرام نے شاہ صاحب کے حالات بیان کیے اور ان کی علمی خدمات پر روشنی ڈالی۔ اس روز عبدالحی صاحب دفتر میں مجھ سے ملنے بھی آئے، لیکن ملاقات نہ ہو سکی۔ افسوس ہے میں یہ پروگرام بھی نہیں سن سکا۔

شاہ صاحب مرحوم کی کن کس باتوں کا ذکر کیا جائے، ان سے متعلق بہت سی باتیں سطح ذہن پر اُبھر آئی ہیں اور حافظہ خوابیدہ واقعات اگلنے لگا ہے۔ مگر صفحات کی تنگ دامانی تفصیل کی اجازت نہیں دیتی۔ وہ شگفتہ کلام اور شائستہ مزاج عالم دین تھے۔ اس ڈھنگ سے بات کرتے کہ سننے والا حیران رہ جاتا۔ بعض دفعہ کوئی ایسا معما سا بیان فرماتے اور ایسے پیچ دار طریقے سے اظہار مدعا کرتے کہ اس کی تہ تک وہی لوگ پہنچ سکتے جو ان کے اسلوب گفتگو سے آشنا تھے۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

وہ لاہور کی مشہور آبادی سمن آباد میں رہتے تھے۔ پہلے کرائے کا مکان تھا، بعد میں این بلاک میں اپنا مکان بنا لیا تھا۔ مکان کا نمبر ہے ۵۰۰ - !! ہمارے ایک دوست عبدالحی قریشی صاحب بھی جو ریڈیو پاکستان لاہور سے وابستہ ہیں سمن آباد میں مقیم تھے۔ ایک دن شاہ صاحب نے ان سے پوچھا "آپ کہاں رہتے ہیں؟" کہا "مین روڈ، سمن آباد میں" سوال کیا "اور آپ؟" فرمایا "میں بھی وہیں رہتا ہوں، این بلاک میں" کہا "مکان کا نمبر؟" جواب دیا "بعد میں آگاہ کروں گا" بس اپنے مکان کے نمبر میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میرا نمبر جمع کر لیجیے، میرے مکان کا نمبر ہو جائے گا۔ یہ ایک معما بھی ہے، اسلوبِ بے تکلفی بھی۔ پہلو اپنے ظاہری تقدس کی نفی بھی ہے۔ جواب آسان ہے، اصحابِ فہم سمجھ لیں گے۔ وضاحت کی ضرورت نہیں۔

شاہ صاحب اصلاً پھلواری کے رہنے والے تھے اور اپنے آپ کو "پھلواروی" لکھتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ طبعاً اور مزاجاً بھی وہ "پھلواری" سے تھے۔ چلتا پھرتا باغیچہ اور رواں دواں گلستاں۔!

ان کو اللہ نے بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ ایک خوبی ان میں یہ تھی کہ خواب کی تعبیر دینے میں ماہر تھے۔ مولانا محمد حنیف ندوی بھی علمِ تاویلِ رویا سے بہرہ ور ہیں۔ قلتِ صفحات مانع نہ ہوتی تو چند خواب اور ان کی وہ تعبیر عرض کرتا جو مولانا ندوی نے دی اور بعد میں شاہ صاحب سے رجوع کیا تو انھوں نے بھی وہی تعبیر دی، اور صحیح ثابت ہوئی۔

شاہ صاحب معتدل اور متوازن جسم کے آدمی تھے۔ کسرتی بدن تھا اور قد رسیلا قد، صحت ایسی اچھی تھی کہ پچاس پچپن سے زیادہ عمر کے معلوم نہیں ہوتے تھے۔ ابتدا میں سائیکل پر دفتر آتے تھے۔ پھر موپڈ کی لے لی تھی، بعد میں سکوٹر خرید لیا تھا۔ سکوٹر چلاتے ہوئے جوان دکھائی دیتے تھے۔

اپنے ساتھی بالخصوص چھوٹے پر شفقت فرماتے۔ ایک ساتھ چلتے ہوئے تھوڑے سے بہت پیسے خرچ کرنے کی ضرورت پیش آتی تو (میرا تجربہ یہ ہے کہ) خود ہی خرچ کرتے۔ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ میں ۱۹۶۵ء میں مرکزی وزارتِ قانون نے ایک لیگل کمیٹی قائم کی، جس کے ذمے یہ کام تھا کہ اسلام میں جو قانونی نوعیت کے مسائل ہیں، ان پر غور کیا جائے، اور ان کو قانونی زبان میں ڈھال کر متعلقہ وزارت کو بھیجا جائے۔ اس کمیٹی کے پانچ ارکان تھے، جن میں دو بیرسٹر تھے۔ ایک جناب عبدالسلام شکور (اب کئی سال سے ہائی کورٹ کے جج ہیں)، دوسرے چوہدری محمد عارف (جو بعد میں ہائی کے ایڈووکیٹ جنرل بھی رہے)، تیسرے مولانا سید محمد جعفر شاہ صاحب، جن کی رہنمائی میں یہ کمیٹی کام کرتی تھی۔ چوتھے ڈاکٹر سخاء اللہ مرحوم اور پانچواں یہ خاکسار راقم الحروف۔! بلکہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ میں میرا تقرر اس کمیٹی کے رکن کی حیثیت ہی سے ہوا تھا۔ کمیٹی کا اجلاس ہفتے میں تین دن — بدھ، جمعرات، اور جمعہ کو نمازِ مغرب کے بعد ادارے کے دفتر میں — ہوتا تھا اور دو ڈھائی گھنٹے جاری رہتا تھا۔ میں اور شاہ صاحب ادارے کے مستقل ارکان ہی سے تھے۔ اجلاس کے دنوں میں دفتر سے چھٹی کے بعد گھر جانا اور پھر واپس آنا مشکل ہوتا تھا، لہذا ہم دونوں عام طور پر شام تک دفتر ہی میں رہتے۔ شاہ صاحب صبح کو اپنے اور میرے لیے گھر سے دوپہر کا کھانا لے آتے تھے اور ہم مل کر کھاتے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کبھی کسی ہوٹل میں چلے جاتے، عام طور پر بل شاہ صاحب ادا کرنے کی کوشش کرتے، لیکن بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا کہ میں "بازی" لے جاتا، "کسی مارکر" آگے نکل جاتا اور شاہ صاحب کو "ناکام" بنا دیتا۔

رمضان کا مہینہ آیا تو ایک اجلاس ڈاکٹر سخاء اللہ کے مکان پر ہوا، انھوں نے ارکان کمیٹی کی بہت تواضع فرمائی۔ باقی اجلاس شاہ صاحب کے مکان پر ہوئے۔ شاہ صاحب شان دار افطاری کراتے اور عمدہ کھانا کھلاتے۔ مغرب کی نماز کے لیے امامت کا بار مجھ پر ڈالنے کی کوشش کرتے۔ لیکن میں انھیں "کامیاب" نہ ہونے دیتا اور "پیشوائی" پر مجبور کر دیتا ــــ جس کا کام اسی کو ساجھے ــــ!

اس کمیٹی میں بعض مسائل کی تعبیر و تشریح سے متعلق کبھی اختلاف رائے بھی ہو جاتا اور اس میں شدت بھی آجاتی۔ لیکن شاہ صاحب کو میں نے دیکھا کہ ان میں بہت لچک اور رواداری تھی۔ وہ دوسرے کی رائے کا احترام کرتے تھے اور اختلاف کی صورت میں اس کی رائے کو مان لینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔ بعض دفعہ اجلاس کے بعد تنہائی میں کہہ دیتے کہ تمھاری رائے سے مجھے اتفاق نہیں تھا، لیکن اختلاف بھی نہیں کرنا چاہتا تھا، لہٰذا تمھاری بات تسلیم کر لی۔ میں اس حوصلہ افزائی پر ان کا شکریہ ادا کرتا۔

ایک دن چند ارکانِ ادارہ کی موجودگی میں، میں نے ان کو "یا سادات" اور "یا حضرات" کہہ کر خطاب کیا۔ بہت خوش ہوئے، کہنے لگے، واقعی میری ذات میں کئی سید اور کئی "حضرت" جمع ہیں۔ میں نے عرض کیا، "سید" اور "حضرت" واحد کے صیغے ہیں، معزز آدمی کو صیغۂ جمع سے خطاب کرنا چاہیے۔ اس کے بعد میں انھیں "شاہ صاحب" کہتا تو "غلطی" کی طرف توجہ دلاتے اور فرماتے "یا سادات" یا "یا حضرات" کہو!

شاہ صاحب ۱۵ جون ۱۹۵۱ء کو ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ سے منسلک ہوئے تھے۔ انھوں نے ادارے کے لیے بہت سے مضامین لکھے اور متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ اگست ۱۹۷۳ء میں ان کی نظر کچھ کمزور ہو گئی تو ادارے سے علیحدگی کا فیصلہ کیا۔ بہت کوشش کی گئی کہ اپنا فیصلہ واپس لے لیں اور آنکھوں کا علاج کرائیں، لیکن نہیں مانے اور فرمایا، جب میں ادارے کا پورا کام نہیں کر سکتا تو اس میں رہنے اور تنخواہ وصول کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔ چنانچہ یکم ستمبر ۱۹۷۳ء کو انھوں نے علیحدگی کی درخواست دی۔ جس میں لکھا کہ میری بینائی کمزور ہو گئی ہے، لہٰذا یکم اکتوبر سے مجھے ادارے کی خدمت سے سبک دوش سمجھا جائے۔ ۲۹ ستمبر ۱۹۷۳ء کو ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ ہوئی اور بادلِ نخواستہ ان کی درخواست منظور کر لی گئی۔ بائیس سال ڈھائی مہینے تک ادارے میں جو علمی و تصنیفی خدمات انھوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے انجام دیں، ان کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا اور ان کی صحت و عافیت کے لیے دعا کی گئی۔

مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی ندوی، حقیقت یہ ہے کہ بہت اونچے آدمی تھے اور بہت خوبیوں کے مالک تھے۔ ایسے ہمہ اوصاف موصوف لوگ اب کہاں پیدا ہوں گے، وہ سانچے ہی ٹوٹ گئے ہیں جن میں یہ لوگ ڈھلے تھے۔

شاہ صاحب کے ایک ہی فرزند ہیں اور ان کا نام ہے، شاہ موسیٰ۔! نوجوان ہیں، والدِ گرامی کے ساتھ ہجرت فرما کر آباد، کراچی میں اقامت گزیں ہو گئے تھے۔ اپنی (آٹھ یا نو) بہنوں میں سب سے چھوٹے ہیں۔ اللہ انھیں سلامت رکھے اور اپنے آبا و اجداد کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ ان کے باقی رشتے دار بھی وہیں ہیں۔ شاہ صاحب کی وفات کے چند روز بعد پروفیسر محمد اسلم نے بتایا کہ شاہ موسیٰ آج کل لاہور آئے ہوئے ہیں۔ مکان پر حاضر ہوا تو "محمد جعفر پھلواروی" کے بجائے "موسیٰ جعفر" کے نام کی تختی نصب تھی۔ گھنٹی بجائی تو خاموش تھی۔ آہنی پھاٹک پر دستک دی مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ اتنے میں ایک اور صاحب آ گئے، انھوں نے اندر جھانک کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ وہ صاحب تو چلے گئے، لیکن میں کچھ دیر دروازے پر کھڑا رہا — دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے، مرحوم کی روح کو آنسوؤں کے چند قطروں کا نذرانہ پیش کیا اور حزن و ملال کا بوجھ اٹھائے ہوئے واپس آ گیا۔

خیال یہ تھا کہ شاہ صاحب کے بارے میں جو گزارشات معرضِ تحریر میں لانا مقصود ہیں، وہ زیادہ سے زیادہ پانچ یا چھ صفحات میں ختم ہو جائیں گی، لیکن یہ "حکایتِ عشق" اس درجے لذیذ تھی کہ دراز سے دراز تر ہو گئی اور ابھی بہت سی باتیں باقی ہیں۔

شاہ صاحب نے اردو، عربی اور انگریزی تینوں زبانوں میں لکھا۔ اردو میں بہت زیادہ لکھا۔ ان کے مضامین و مقالات دہلی کے ماہ نامہ "پیشوا" اور "مولوی"، لاہور کے ثقافت، المعارف، کوثر، ایشیا، الاعتصام، چٹان، امروز، لیل و نہار، اردو ڈائجسٹ، کراچی کے فاران، حریت اور راولپنڈی کے فیض الاسلام وغیرہ رسائل و جرائد میں چھپتے رہے۔ ریڈیو پاکستان سے بے شمار تقریریں نشر ہوئیں۔ ٹیلی ویژن پر بھی تقریریں کیں۔ ان کی متعدد تصنیفات ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کی طرف سے شائع ہوئیں۔ اس سلسلے میں "المعارف" کی آئندہ اشاعت میں کچھ معروضات پیش کی جائیں گی۔ ان شاء اللہ العزیز۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواروی مرحوم کی چند تصنیفات

معارفِ حدیث اردو ترجمہ معرفۃ علوم الحدیث

"معرفۃ علوم الحدیث" فنِ حدیث میں ایک بڑی گراں قدر تصنیف تسلیم کی گئی ہے۔ اس کے مصنف امام ابو عبداللہ الحاکم نیساپوری (۳۲۱ھ ۔ ۴۰۵ھ) ہیں۔ اس میں احادیث کی قسمیں، راویانِ احادیث کے مراتب اور ان کے حالات، نیز اس سلسلے کی دوسری معلومات سب آگئی ہیں۔ اس کتاب سے فنِ حدیث کا کوئی طالب علم بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ ترجمہ بڑا شگفتہ اور رواں ہے ـــ صفحات ۳۸۸ قیمت ۱۵ روپے

انتخابِ حدیث

یہ کتاب ان احادیث کا مجموعہ ہے جو زندگی کی اعلیٰ قدروں سے تعلق رکھتی ہیں اور جن سے فقہ کی تشکیلِ جدید میں بہت مدد مل سکتی ہے۔ ہر حدیث کی الگ سرخی قائم کی گئی ہے اور اس کا سلیس ترجمہ بھی درج ہے یہ مجموعہ حدیث کی چودہ کتابوں کا خلاصہ اور بے مثل انتخاب ہے ـــ صفحات ۲۰+۶۶۴ قیمت ۲۴ روپے

گلستانِ حدیث

یہ چالیس منتخب احادیثِ نبوی کی تشریح ہے۔ ہر حدیث کے مضمون کی تائید میں دوسری احادیث اور قرآن کریم کی آیات سے ان کی مطابقت بہت دل نشیں انداز میں بیان کی گئی ہے۔

صفحات ۲۰۸ قیمت ۱۵ روپے

چند ازدواجی مسائل

اس کتاب میں جن ازدواجی مسائل کے بارے میں بحث کی گئی ہے وہ اپنی جگہ نہایت اہم ہیں۔ مثلاً: کم سنی کی شادی اور فسخِ نکاح کا اختیار، یک بارگی تین طلاق دینے کے متعلق شرعی حکم، خلع، نشے کی حالت میں طلاق، رسمِ جہیز اور جہیز کے مسائل۔ صفحات ۸+۱۰۰ قیمت ۸ روپے

ملنے کا پتا: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

© rasailojaraid.com